ڈاکٹر محمود الحسن

استاد شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی، آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ساجدہ سلطانہ

رسیرچ اسکالر،ایم فل اردو، نیشنل یونیورسٹی، آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فنِ خاکہ نگاری: مولوی عبد الحق اور شاہد دہلوی کے خاکوں کا تقابلی مطالعہ

Dr. Mahmood-ul-Hassan

Assistant Prof, Department of Urdu, NUML, Islamabad.

Sajida Sultana,

MPhil Research Scholar Department of Urdu, NUML, Islamabad.

Art of Sketch Writing: Comparative Study of Sketch Writing of Moulvi Abdul Haque and Shahid Dehlvi

Art of Sketch Writing is such literary genre in which salient features and characteristics of a personality are highlighted. In present article, Moulvi Abdul Haque and Shahid Ahmed Dehlvi's sketch writing skill has been analyzed along with tradition of Urdu Sketch Writing. It has been strived to determine literary place of Moulvi Abdul Haque and Shahid Dehlvi in the art of sketch writing in the perspective of various critics.

انسانی فطرت کے دو پہلو ایسے ہیں جن سے ادب کی بہت سی اصناف جنم لیتی ہیں۔ ایک تو لوگوں کی قصہ کہانیوں میں دلچسپی دوسرا اپنے ارد گرد کے انسانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا تجسّس۔ اگر آپ ذرا توجہ دیں تو یہ معلوم ہو گا کہ پہلی دلچسپی کے باعث داستان، ناول، افسانہ اور ڈراما جیسی اصناف وجود میں آتی ہیں، جبکہ انسانوں کے بارے میں جاننے کے زیرِ اثر سیرت، سوانح، خود نوشت اور خاکے وجود میں آتے ہیں۔ خاکہ نگاری کے بارے میں مولوی عبد الحق نے اسی

حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ''انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے''(۱) سیرت ہو یا سوانح، خودنوشت ہو یا خاکہ۔ ان سب میں انسانی حالات کی عکاسی ہے۔

اگرچہ سوانحی ادب میں سیرت، سوانح اور خودنوشت اپنے خدوخال کے اعتبار سے مختلف ہیں تاہم ایک چیز ان سب میں مشترک ہے اور وہ ہے وضاحت اور طوالت جس طرح وقت کی قلت کے سبب قصہ گوئی نے داستان سے افسانے بلکہ افسانچے تک کا سفر طے کیا ہے، اسی طرح سوانحی اصناف میں سیرتوں اور طویل سوانح عمریوں کے مقابلے میں خاکے نے جنم لیا ہے۔ پورٹریٹس آف جینئس کا مصنف لکھتا ہے۔

> I have been astonished that so little is known by the average readers, of lives and characters of the exceptional men. Friends tell me that they are interested but have not the time to wade through a mas of letters biographis and autobiographies. (2)

اور واقعی یہ بالکل درست ہے کہ عام لوگ غیر معمولی شخصیتوں کے حالات جاننا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس وقت نہیں کہ وہ اتنی بڑی بڑی سوانح عمریاں پڑھ سکیں۔ چنانچہ وہ مزید لکھتا ہے۔

> As an artist, I have discovered that a "Sketch" with, sometimes, gives a true picture then a detailed portrait. (3)

اردو خاکہ نگاری پر بہت کم مواد ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بعض مصنفین سوانح اور خاکے میں فرق محسوس نہیں کرتے۔ نظیر صدیقی منٹو کے خاکوں پر یوں رقم طراز ہیں۔

> ان رقعوں میں نہ کسی کی پیدائش بتائی گئی ہے نہ کسی کے مرنے کے تاریخ۔۔۔ دراصل رقع نگاری میں ان تفصیلات کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ مجھے ''نقوش'' کا شخصیات نمبر دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں ہمارے کئی ارباب قلم نے بھی رقع نگاری کو سوانح نگاری کے مترادف بنا کر رکھ دیا ہے۔ (۴)

اس اقتباس میں نظیر صدیقی نے جس صنف نثر رقع نگاری کہا ہے اس کے لیے اب ''خاکہ نگاری'' کی ترکیب رائج ہو گئی ہے۔

خاکہ نگاری میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ خاکہ نگار نے موضوع کے طور پر کس شخصیت کا انتخاب کیا ہے؟ مصنف نے جس شخصیت کا انتخاب کیا ہے، کیا لوگ اس کے بارے میں جاننے کے لیے متجسّس ہیں؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اور دنیا کی دیگر زبانوں میں بہت سی ایسی شخصیات کے خاکے لکھے گئے جن میں بظاہر کوئی کشش نہیں تھی۔ یہاں خاکہ نگار

کو چاہیے کہ وہ اس کی ذات میں کچھ ایسے اوصاف تلاش کرے اور دکھائے جن میں قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان موجود ہو۔ اس سلسلے میں یہ بات زیادہ اہم نہیں ہوگی کہ وہ شخصیت مشہور و معروف ہے یا گمنام۔ اگر ایسا نہیں تو نا قابلِ توجہ شخصیت کو اپنا موضوع بنانا گویا خاکے کی ناکامی کی خشت اوّل رکھنا ہے۔ اصل میں ہر صنف ادب کے کچھ اصول ہوتے ہیں خاکہ نگاری کے لیے ضروری ہے کہ جس شخصیت کی مرقع کشی کی جائے اس کے اندر کچھ ایسی حیران کر دینے والی خصوصیات ہوں جو خاکہ نگار کو اپنی طرف متوجہ کر لیں اور اسے لکھنے پر مجبور کر دیں اور پھر لکھنے والے میں بھی وہ جرات و بیباکی ہو کہ وہ شخصیت سے جڑی تمام سچائیوں کو حقیقت کا روپ عطا کر دے۔

خاکہ نگار کے لیے بہتر تو یہ کہ وہ اپنے موضوع یا ممدوح سے ذاتی واقفیت رکھتا ہو۔ وہ اپنے موضوع سے جتنا ذاتی قرب رکھتا ہو گا اتنا ہی وہ بہترین خاکہ لکھ سکتا ہے۔ اگر خاکہ نگار زیر طبع شخصیت سے ذاتی تعلق نہ رکھتا ہو۔ یا پھر زمانی و مکانی دوری ہو تو پھر اس کی قوت متخیلہ اس قدر تیز ہونی چاہیے کہ وہ تاریخ، سیرت یا سوانح پڑھ کر یا اس کے قریبی جاننے والوں سے حالات سن کر اپنے آپ کو اس شخصیت سے اتنا قریب محسوس کرنے لگے کہ عالم تصور میں وہ اسے بولتا چالتا، چلتا پھرتا اور بھرپور زندگی گزارتا دیکھ سکے اور پھر اسے اپنے اسلوب بیان کے مطابق تحریر کر سکے۔

مصنف اور موضوع کا تعلق کتنا اہم ہے اس کے بارے میں ایک محقق لکھتا ہے:

> خاکہ ایسی صنف ادب ہے۔۔۔ جس میں کسی ایسے انسان کے خدو خال پیش کیے جائیں، کسی ایسی شخصیت کے نقوش ابھارے جائیں جس سے لکھنے والا جلوت اور خلوت میں ملا ہو۔ اس کی عظمتوں اور لغزشوں سے واقف ہوا ہو۔(۵)

اختصار، خاکے کی سب سے اہم اور بنیادی خوبی ہے سیرت اور سوانح کے مقابلے میں جامعیت اور اختصار، شخصیت کے تفصیلی حالات کی بجائے صرف نمایاں خدوخال پیش نظر رکھے جائیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ خاکہ نگاری، سیرت نگاری سے بالکل مختلف ۔۔۔ مختصر افسانے کی طرح ادب کی مقبول ترین صنف ہے۔" (۶) خاکہ نگار اپنے خاکے میں کسی شخصیت کے چھپے ہوئے گوشے نہایت چابک دستی سے مختصر اور موزوں الفاظ کی مدد سے بیان کرتا ہے۔ قلم کار کو اپنی زیر موضوع شخصیت کو اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ اس کی چلتی پھرتی تصویر سامنے آجائے۔ خاکہ کسی شخصیت کا لکھا جاتا ہے اور شخصیت کو اللہ تعالیٰ تخلیق کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ مجموعی طور پر شخصیت کا وہی تاثر ابھرنا چاہیے جیسا کہ اسے خدا نے بنایا ہے۔ کسی بھی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ پہلی نظر میں تو کسی شخص کا ظاہری پہلو ہی سامنے آتا ہے۔ اس کی شکل و صورت، ڈیل ڈول اور گفتگو کے انداز سے اس کے متعلق ایک تاثر قائم ہوتا ہے۔ اچھا خاکہ نگار اپنے مشاہدے اور تاثر کی مدد سے شخصیت کی حقیقی اور اندرونی تصویر قارئین کے سامنے لے آتا ہے۔ اس کی بہترین مثال فرحت اللہ بیگ کے خاکے ڈپٹی نذیر احمد کی دی جاسکتی ہے کہ جس میں بظاہر نذیر احمد کا ظاہری حلیہ، ان کا گھریلو نقشہ اور ان کی زبان زدعام خوبیوں کا ذکر ہے لیکن اس کے پس منظر میں ڈپٹی صاحب کے حسن کردار اور ذہانت ولیاقت کو اس طرح اجاگر کیا جاتا ہے کہ ان کی بشری کمزوریاں ان کی خوبیوں کے مقابلے میں دب کر رہ جاتی ہیں۔ تاثر کے رنگ کو مزید فعال اور نمایاں کرنے

کے لیے خاکہ نگار چہرہ نویسی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ انسانی شخصیت میں چہرہ اور اس کے تاثرات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً بعض چہرے بارعب ہوتے ہیں، بعض چہرے کرختگی کے حامل ہوتے ہیں۔ بعض متاثر کرنے والے اور خوبصورت۔ کچھ سے ذہانت ٹپکتی ہے اور کچھ کند ذہن اور غبی نظر آتے ہیں۔ چہرے کی مدد سے فوری نتائج اخذ کرنے کے لیے خاکہ نگار کو انسانی نفسیات کا ماہر ہونا چاہیے۔ خاکہ نگار موضوع شخصیت کے قد و قامت، تن و توش اور لباس وغیرہ کی تفصیلات فراہم کرتا ہے، کہ قاری چشم تصور سے اسے دیکھ سکے۔ اس سلسلے میں خاکہ نگار کا تیز مشاہدہ اور اس مشاہدے کو سپردِ قلم کرنے کی صلاحیت بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

واقعات کے درست انتخاب کا طریقہ وسلیقہ خاکہ نگار کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ سوانح نگار کی طرح خاکہ نگار کے سامنے بھی بے شمار واقعات بکھرے ہوتے ہیں جن کے انتخاب میں خاکہ نگار کو احتیاط سے کام لینا ہوتا ہے۔ خاکہ نگار کی اس خصوصیت کی طرف یحییٰ امجد نے اسطرح لکھا ہے۔

> خاکہ ایک تخلیقی صنف ادب ہے جس میں زندہ شخصیت، گوشت پوست کا بدن لیے، علمیت کی بھاری بھرکم عباؤں کو دم بھر کے لئے اتار کر روزمرہ کے لباس میں نظر آتی ہے اور ہم انھیں ویسا دیکھتے ہیں جیسا وہ سچ مچ تھے نہ کہ جیسا ظاہر کرتے تھے۔(۷)

قلمی تصویر کشی کرتے ہوئے خاکہ نگار کو اعتدال کا دامن تھامے رکھنا چاہیے اسی اپنے تخیل سے کام لیتے ہوئے نہ تو کسی تصویر کو بگاڑنا چاہیئے اور نہ ہی سنوارنا چاہیے بلکہ وہ جیسی ہے ویسے ہی پیش کرنی چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خاکہ نگار کو واقعات کے انتخاب میں توازن اور احتیاط رکھنی چاہیے اور کسی پہلو کی طرف زیادہ نہیں جھکنا چاہیے۔ خاکہ نگار کا اسلوب بیان وہ ہتھیار ہے جس سے کام لے کر وہ اپنی تحریر کو ادبی فن پارے میں تبدیل کر سکتا ہے اگر اسلوب بیان منفرد اور متاثر کن نہ ہو تو خاکہ نگار کی باقی خوبیاں بھی بے وقت ہو جاتی ہیں اور وہ ایک اچھا خاکہ لکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ایک مؤثر اسلوب ہی کسی لکھاری یا مصنف کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم اس بارے میں کہتے ہیں کہ ایک کامیاب نثر نگار کی علامت یہ ہے کہ وہ۔۔۔ پڑھنے والوں کے دل میں ایک واضح اور روشن تصویر اتار دے۔" (۸)

خاکہ نگار اپنے شخصی خاکوں میں اختصار سے کام لیتے ہوئے رنگ بھرنے کا ہنر جانتا ہے تو وہ اس مشکل فن سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

اردو میں خاکہ نگاری کی روایت :

اردو میں خاکہ نگاری کی روایت ہمیں محمد حسین آزاد کی کتاب "آب حیات" سے ملتی ہے۔ یہ وہ پہلی کتاب ہے جس نے اردو خاکوں کا شعور دیا ہے اور خاکے کی عملی مثالیں پیش کی ہیں۔ محمد حسین آزاد کے بعد ہمیں جو شخصیت بحیثیت خاکہ

نگار نظر آتی ہے وہ مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں۔ مرزا فرحت اللہ کے اسلوب میں بھی آزاد کی جھلک نظر آتی ہے۔ "ڈپٹی نذیر احمد" اور "ایک وصیت کی تعمیل" مرزا کے یادگار خاکے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر" خاکوں کا ایک مجموعہ ہے۔ "چند ہم عصر" کے بارے میں بعض ناقدین کا خیال ہے کہ وہ خاکہ نگاری کے فن پر پورا نہیں اترتی چونکہ اس میں شخصی تصویریں کم اور انسانی فضائل زیادہ پیش کیے گئے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے خاکے "گنج ہائے گراں مایہ" معیاری خاکے ہیں اور ان کے خاکے "ایوب عباسی" کو اردو ادب کے بہتری خاکوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

ان کے بعد جو خاکے اپنی دلچسپی کے باعث کچھ نمایاں نظر آتے ہیں ان میں اشرف صبوحی کے "دلّی کی چند عجیب ہستیاں" عصمت چغتائی کا لکھا ہوا اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ "دوزخی" اردو کے چند اچھے خاکوں میں سے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے خاکوں کا ایک مجموعہ "گنجے فرشتے" ہے۔ منٹو نے خاکے کو افسانوی اور سائنٹفک نقطہ نظر دیا ہے۔ "لاؤڈ اسپیکر" کے عنوان پر خاکوں کا ایک اور مجموعہ منٹو کی حقیقت نگاری کا ترجمان ہے۔ خاکہ نگاری کے حوالے سے "نقوش" لاہور کے دو شخصیات نمبر بہت اہم ہیں۔ "نقوش" میں اگر سب نہیں تو بعض خاکے فنی اعتبار سے بہت اعلیٰ ہیں۔ محمد طفیل کے لکھے ہوئے خاکوں کے کئی مجموعے سامنے آئے ہیں۔ مثلاً "صاحب"، "جناب"، "معظم"، "محترم" وغیرہ ان میں اندازِ تحریر بے تکلف ہے۔ عبدالمجید سالک کی "یاران کہن" چراغ حسن حسرت کی "مردم دیدہ" رئیس احمد جعفری کی دیدوشنید، الطاف حسین بریلوی کی "راہی اور راہنماء" عبدالسلام خورشید نے "دمے صورتیں الٰہی" کے عنوان سے خاکے لکھے ہیں۔ عبادت بریلوی کی "رہ نوردان شوق" غلام احمد فرقت کی "ناروا" میں اچھے خاکے پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ مرزا ادیب کے خاکے "ناخن کا قرض"۔ انتظار حسین کے خاکے "ملاقاتیں" ظہیر احمد کے خاکے "اب بھی زندہ ہیں"۔ حکیم آفتاب احمد کے خاکوں کا مجموعہ "کاروانِ شوق" آج بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ "البم" اور "دوسرا البم" خاکوں کے یہ دونوں مجموعے فارغ بخاری نے تحریر کیے ہیں۔ "اڑتے خاکے" ضمیر جعفری کے خاکوں کا مجموعہ ہے جو اپنے اندر زندگی کی دلچسپیاں لیے ہوئے ہے۔ "آسماں کیسے کیسے" میں صادق الخیری نے اپنے دوستوں وغیرہ کے خاکے تحریر کیے ہیں۔ اس کے علاوہ جوش نے "یادوں کی برات"، مختار مسعود نے "سفر نصیب" ماجد دریا آبادی نے "معاصرین" ابوالحسن ندوی نے "پرانے چراغ" اور کوثر نیازی کے مرتبہ خاکے لکھے گئے ہیں۔

خاکہ نگاری کی صنف اردو میں زیادہ قدیم نہیں ہے۔ خاکوں کا بیشتر سرمایہ اس صدی کی پیداوار ہے۔ تاہم خاکہ نگاروں کے اس ہجوم میں ایسے خاکہ نگار جو تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے اردو میں روشنی کے مینار نظر آتے ہیں۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی ہیں۔ آیئے اب اپنے موضوع کے دوسرے حصے "مولوی عبدالحق اور شاہدی دہلوی کے خاکوں کا تقابلی مطالعہ" کی طرف بڑھتے ہیں :

مولوی عبد الحق کی خاکہ نگاری :

مولوی عبد الحق کو اردو زبان کا محسن اور بابائے اردو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اردو کی ترویج و ترقی کے لیے وقف کی ہوئی تھی۔ اس وقت مولوی عبد الحق کی علمی، ادبی، تحقیقی، لسانی اور تنقیدی خدمات زیرِ بحث نہیں بلکہ یہ جائزہ لینا ہے کہ خاکہ نگاری میں ان کا کیا مقام ہے۔ مولوی صاحب کو خاکہ نگاری کے فن میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس فن کی روایت کو انھوں نے آگے بڑھایا۔ اور معاصر شخصیتوں کے قلمی خاکے لکھے۔ جو "چند ہم عصر" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے مشاہیر زمانہ قسم کی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ نور خان اور دیومالی جیسے معمولی انسان بھی ان کا موضوع ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آدمی ذات پات سے بڑا نہیں ہوتا بلکہ اس کی صفات اسے ممتاز کرتی ہیں۔ مولوی صاحب کے خاکوں کی اہم صفت یہ ہے کہ وہ شخصیتوں سے مرعوب نہیں ہوتے اور انھیں حق گوئی و بے باکی سے پیش کرتے ہیں۔ مولوی صاحب نے عام طور پر مناقب خوانی سے پرہیز کیا ہے۔ دنیا میں کوئی شخص بھی بشری تقاضوں سے عاری نہیں ہو سکتا۔ شخصیت خوبیوں اور کوتاہیوں دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مولوی صاحب اپنے ایک خاکے "سید محمود" میں ان کی وفات پر تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اسی طرح نہ انسان بے عیب ہوا ہے نہ ہو گا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جب کسی شخص میں ایسی خوبیاں ہوں جو عام طور پر دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور جن کا ہونا عجائبات اور نوادر میں سے ہو تو ایسے شخص کا ہم میں سے اٹھ جانا کیسے کچھ رنج اور کیسے کچھ الم کا باعث نہ ہو گا۔ (۹)

مولوی صاحب نے شخصیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی کوتاہیوں کا بھی اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ ان کے خاکے اور زیادہ دلچسپ ہو گئے ہیں۔ مولوی سید بلگرامی کا خاکہ لکھتے ہوئے کہتے ہیں :

> مولوی سید علی مرحوم بلاشبہ مختلف علوم والسنہ کے عالم تھے لیکن ان کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے علم کے مقابلے میں ان کا عمل بہت ہی کم تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ طبعاً جفاکشی اور عملی کام کی طرف کم راغب تھے۔ دوسرے دکن کی آب و ہوا اور خاص کر یہاں کے حالات اس وقت کچھ ایسے تھے کہ آدمی کرتا بھی تو کچھ نہ کر سکے۔ (۱۰)

مولوی عبد الحق نے کسی شخصیت پر خاکہ لکھنے سے پہلے اس شخصیت کا مطالعہ کیا ہے اور غور و فکر سے کام لیتے ہوئے اس کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ تجزیاتی نقطۂ نظر اور لطیف طنز کے اشاروں نے مولوی صاحب کے پیش کردہ خاکوں میں زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ خواجہ غلام الثقلین کے بارے میں لکھتے ہیں؛

> آخر زمانے میں ان پر مذہب کا رنگ بہت غالب آ گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے مطالعے نے زمانے کا ساتھ نہ دیا ہو یا صحت کی خرابی کچھ مساعد ہوئی ہو یا یہ کہ مذہب

کے غوامض اور اسرار کی طرف انھوں نے خاص طور پر توجہ کی ہو۔ خیر کوئی وجہ ہو، ان پر مذہب کا رنگ گہرا چڑھ گیا تھا اور ان کے آخر زمانہ کی تقریروں اور تحریروں کے فقرے فقرے سے مذہب کی بو آتی ہے۔(۱۱)

مولانا وحید الدین سلیم کے بارے میں تحریر کرتے ہیں :

مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات حد سے تجاوز کر جاتے تھے مگر بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ مصلحت، سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا۔ جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے اور جو جی چاہتا کر گزرتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے۔ کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل وقوع بھی ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ان کی باتوں سے اکثر ناراض ہو جاتے تھے۔ جس طرح باوجود زبردست اخبار نویس ہونے کے سیاسیات کا ذوق نہ تھا، اس طرح زبردست عالم و فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے۔ یہ ذوقی چیز ہے اسے علم و فضل سے کوئی واسطہ نہیں۔(۱۲)

کوئی بھی خاکہ نگار زیادہ تر کسی شخصیت کے ان پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے جو پہلو انھیں زیادہ عزیز ہوں۔ یہ بات "چند ہم عصر" کے خاکوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید مولوی صاحب کی خاکہ نگاری پر یوں لکھتے ہیں :

چند ہم عصر" میں ان کے مرقعے نصیحت آمیز ہیں اور انداز مبصرانہ۔ وہ شخصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ شخصیات پر تبصرہ کرتے ہیں اور قاری کو نصیحت کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کے اسلوب اور وزن و وقار کے باوجود قاری شخصیت سے متاثر نہیں ہوتا۔(۱۳)

لیکن بحیثیت مجموعی مولوی صاحب کے مرقعوں یا خاکوں پر یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ مرقع نگاری میں انھوں نے جذباتی انداز اختیار کرنے سے گریز کیا ہے اور ان کے ہاں تاثرات کم اور حقیقت نگاری زیادہ ملتی ہے۔ انھوں نے ہر جگہ خواہ مخواہ نصیحت بھی نہیں کی ہے بلکہ وہ اوصاف بیشتر انسانوں میں جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں جن کی بدولت کوئی شخصیت محترم و معتبر ہو جاتی ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی مولوی صاحب کی شخصیت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وہ شخصیتوں کے سیرت کردار اور ذہن و مزاج کو دنیا کے سامنے نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور نئے چلنے والوں کے لئے ایک آزمودہ راہ عمل متعین کر دیتے ہیں۔ شخصیت نگاری کا یہ بہت بڑا آرٹ ہے کہ شخصیتیں دنیا کے سامنے مشعل راہ بنا کر پیش کی جائیں اور ان کو دیکھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ اور امنگ پیدا ہو۔ نہ یہ کہ شخصیتوں کو ایک بت بنا دیا جائے اور دنیا صرف اس کی پرستش کرتی رہے اور اپنے فرائض بھول جائے۔ ڈاکٹر

صاحب کی شخصیت کا یہ آرٹ ہے جو اردو میں اپنی مثال آپ ہے اور اصل میں یہ شخصیت نگاری ہے۔(۱۴)

شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری :

شاہد احمد دہلوی، اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے پوتے ہیں۔ماہنامہ ''ساقی'' کی اردو کے حوالے سے خدمات انتہائی قابلِ ستائش ہیں۔اردو کا یہ اہم ماہنامہ شاہد احمد دہلوی کی زیر ادارت نکلتا رہا۔شاہد دہلوی بطور مترجم بھی اہم مقام رکھتے ہیں اور ان کے کیے ہوئے تراجم کے نمونے اردو ادب میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔شاہد احمد دہلوی دلّی کی تہذیب وروایت کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔دلی کے محاورے اور زبان اس خوبی سے اپنی تحریر میں استعمال کرتے کہ ڈپٹی نذیر احمد کی یاد تازہ ہو جاتی۔شاہد احمد دہلوی ایک اچھے مترجم،ادیب اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب خاکہ نگار بھی تھے۔شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا اہم مجموعہ ''گنجینۂ گوہر'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں سترہ شخصیات کے خاکے ہیں۔شاہد کا اسلوب واضح اور منفرد ہے۔اور ان کا یہ انداز انھیں دوسرے خاکہ نگاروں سے الگ کر دیتا ہے۔''گنجینۂ گوہر'' کے مقدمے میں ڈاکٹر جالبی تحریر کرتے ہیں کہ ۱۹۵۰ سے ۱۹۶۲ تک بارہ سال کے عرصے میں انھوں نے جتنے خاکے لکھے وہ سب اس کتاب میں یکجا کر دیئے ہیں۔۱۹۳۳ء میں ''ساقی'' کے ماہ ستمبر کے شمارے میں شاہد احمد دہلوی نے میر ناصر علی کی شخصیت پر ایک خوبصورت مضمون لکھا جو میری نظر میں کسی شخصیت پر لکھا ہوا شاہد کا پہلا خاکہ کہا جا سکتا ہے۔اس مضمون کے بعد ان کی آئندہ تحریروں میں خاکہ نگاری کے عمدہ پیکر دیکھے جا سکتے ہیں۔شاہد، میر ناصر علی کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

''جوانی کی تو میں کہتا نہیں ہاں بڑھاپے میں، میں نے میر صاحب کو سدا ایک ہی سا دیکھا۔ وہی خشخاش داڑھی اور سادہ وضع، مصنوعات سے انھیں نفرت تھی۔منہ میں صرف ایک دانت باقی تھا لیکن اس کے گر جانے پر بھی نقلی دانت نہیں لگوائے۔''(۱۵)

خاکہ نویسی میں چہرہ نویسی کو بہت اہمیت حاصل ہے چونکہ چہرہ انسانی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔شاہد احمد کو چہرہ نگاری میں کمال حاصل ہے۔اس بارے میں یحیٰ امجد لکھتے ہیں۔

''چہرہ نویسی کے باب میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے دوسروں کے لکھے ہوئے چہرے پڑھ کر آپ دھوکا کھا سکتے ہیں۔اس چہرے سے ملتی جلتی شکل پر اس خاص چہرے کا گمان کر سکتے ہیں۔ مگر شاہد صاحب کا چہرہ اگر کہیں ملے گا تو اس خاص آدمی کی گردن پر۔''(۱۶)

شاہد احمد نے عظیم بیگ چغتائی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کو ملاحظہ کیجئے۔

''میں نے دیکھا نیچے کے چار دانت غائب، زرد چہرہ، آنکھوں کے کونوں پر بے شمار جھریاں، کلّے پچکے ہوئے، ہونٹوں کے دونوں طرف قوسیں، لہو پر لاکھا سا جما ہوا، چھوٹی

چھوٹی کتری ہوئی مونچھیں، داڑھی صاف، دبلا پتلا سا شخص، عینک کے موٹے موٹے
شیشوں میں سے مجھے جھانک رہا ہے۔"(۱۷)

چہرہ نگاری کے علاوہ بھی شاہد احمد کسی شخصیت کو مافوق الفطرت نہیں بناتے۔ محمد طفیل اس بارے میں لکھتے ہیں وہ خاکہ نگاری کی اس بلند سطح پر نظر آتے ہیں کہ جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہے اس کے عین مین اظہار کا نام خاکہ نگاری ہے شاہد احمد نے اپنی پیش کردہ شخصیتوں کو چھپایا نہیں بلکہ اس انداز سے ذکر کیا ہے کہ بحیثیت انسان ان کی دلکشی میں اضافہ ہوا ہے۔ شاہد احمد، شوکت تھانوی کے اچھے دوست ہیں لیکن دیکھیے ان کی خامیوں کو کس طرح بیان کرتے ہیں۔

"کبھی انھیں خرچ کرتے نہیں دیکھا، ہمیشہ اپنے آپ کو تنگ دست ظاہر کرتے تھے۔
پانوں کی ڈبیا تو وہ ضرور اپنے ساتھ رکھتے تھے، اس کے علاوہ سگریٹ تک نہیں پیتے
تھے۔ البتہ بڑے آدمیوں کے ساتھ لگے رہنے کا انھیں شوق تھا۔ انھوں نے خوشامد کی
تکنیک کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا بلکہ اس کے ایکسپرٹ ہو گئے تھے۔" (۱۸)

استاد بے خود دہلوی اپنے آپ کو بڑا شکاری کہا کرتے تھے۔ بے خود کے مہاراجہ گوالیار سے اچھے تعلقات تھے۔ ایک دفعہ مہاراجہ کو بتائے بغیر گوالیار گئے تو مہاراجہ کو استاد کی آمد کی اطلاع کیسے ہوتی ہے اس سلسلے میں کیسی عمدہ گپ لگاتے ہیں۔ اس کی جھلک شاہد احمد کے قلم سے دیکھیے۔

"اسٹیشن سے باہر نکلا تو دیکھا کونجوں کی ایک قطار اڑتی چلی آرہی ہے۔ میں نے امین
الدین سے کہا جلدی سے بندوق نکال کر دینا۔ میں نے کارتوس لگا کر فیر کیا۔ ایک کونج
میرے قدموں میں آگری۔ دوسری ان صاحب کے گھر میں جا گری جن کے ہاں میں
مہمان ہوا تھا اور تیسری راج محل میں عین مہاراج کے سامنے گری۔ میرے میزبان
سمجھ گئے کہ یہ کونج بے خود صاحب نے گرائی ہے۔" (۱۹)

اختصار، خاکہ نگاری میں شاہد احمد دہلوی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ شاہد احمد سب کچھ کہہ جاتے ہیں مگر مجال ہے کہ تسلسل میں کہیں جھول یا لطف میں کچھ کمی آئے۔ جونا گڑھ کی ایک علمی شخصیت قاضی احمد میاں اختر کا خاکہ نہایت مختصر ہے لیکن اتنا جامع کہ زندگی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ایک جھلک کا مشاہدہ کیجیے۔

"خدا خدا کر کے ان کے دن پھرے اور نہ جانے کس کی مہربانی سے انھیں سندھ
یونیورسٹی میں اسلامیات کی کرسی ملی۔ ان سے آخری ملاقات سندھ یونی ورسٹی میں
ہوئی، خوش تھے، چھوٹا سا گھر بھی رہنے کو مل گیا تھا۔ کہتے تھے کہ اب جا کر بیوی بچوں کو
بھی لے آؤں گا۔ مگر بدنصیبی نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ بیوی کچھ بیمار پڑیں اور چٹ
پٹ ہو گئیں۔ قاضی صاحب کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ ننھے ننھے سے بچے خود ہی پالتے۔ گھر

میں گھس لگانے کو آدمی نہیں چند مہینے اس حالت میں گزرے ہونگے کہ ہارٹ فیل ہو گیا۔"(۲۰)

ایک اور بڑی بات جو خاکہ نگاری کے سلسلے میں اہم ہے وہ شخصیات سے ذاتی طور پر واقف ہونا۔ شاہد احمد نے صرف انہی شخصیات پر قلم اٹھایا جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔ اور بہت سے ناقدین نے اس کی نشاندہی بھی کی ہے۔ پروفیسر عطاء الرّب "گنجینۂ گوہر" کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

"گنجینۂ گوہر" کے تمام خاکے ان ادیبوں، شاعروں، اور فن کاروں پر لکھے گئے ہیں جن سے مصنف کی نہ صرف ملاقات تھی بلکہ جنھیں بہت قریب سے دیکھا تھا۔"(۲۱)

البتہ یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے بعض خاکوں کے بارے میں دوسروں سے بھی معلومات حاصل کی ہیں لیکن انھوں نے سنی سنائی باتوں کو بھی اپنے تخیل سے اس طرح بیان کیا کہ ایک حقیقی تصویر ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

مولوی عبد الحق اور شاہد احمد کے خاکوں کا موازنہ:

مولوی عبد الحق کی کتاب "چند ہم عصر" پہلی بار ان کے شاگرد شیخ چاند نے چھپوائی تھی جس کا صحیح سن اشاعت معلوم نہ ہوسکا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مجموعہ ۱۹۳۷ یا اس کے قریب بعد میں شائع ہوا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۲، تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء، چوتھا ۱۹۵۳، پانچواں سن اشاعت درج نہیں اور چھٹا ۱۹۵۹ میں مولوی صاحب کی حیات میں شائع ہوا۔ اس تصنیف میں مولوی صاحب نے اپنے تعلق رکھنے والے چند اہم اور غیر اہم لوگوں کے حالات اور کارہائے نمایاں تحریر کیے ہیں اور ان کے خیالات و نظریات پر بحث کی ہے۔ اپنے مواد اور تکنیک کے اعتبار سے اس کتاب کو خاکہ نگاری کے ضمن میں لانا خاصا مشکل ہے۔ ان کا اس کتاب میں انداز اگرچہ مکمل طور پر سوانح تو نہیں لیکن سیرت نگاری ضرور ہے۔ انھوں نے شخصیت کی مختصر سوانح اس انداز سے بیان کی ہے کہ اس پر سیرت کا گمان ہوتا ہے۔ چونکہ ایسا کرتے وقت انھوں نے اس کے نظریات سے بھی بحث کی ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سوانح بیان کرتے وقت مولوی صاحب کا انداز تاریخ سا ہے۔ سیرت اور نظریات سے بحث کرتے وقت تنقیدی مقالے کا سا۔ ان کے مضامین میں اصابت رائے اور توازن و اعتدال کا حسن ہے۔

انھوں نے شخصیت کا مطالعہ کرتے وقت اس کو اپنے عہد کے کینوس میں رکھ کر دیکھا ہے، اور سماجی و معاشرتی تحریکات، اجتماعی میلانات اور عصری واقعات کے اثرات کا مشاہدہ کیا ہے۔ الطاف حسین حالی، محسن الملک، سر راس مسعود، سر سید احمد خان جیسی شخصیات کا مطالعہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انھیں اُن کے عہد کے حوالے سے دیکھا جائے۔ مولوی صاحب نے یہ ذمہ داری حسن خوبی سے نبھائی۔

مولوی صاحب کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ انھیں ان شخصیات میں جو خامیاں نظر آتی ہیں انھیں بلاخوف و جھجک بیان کر دیتے ہیں۔ سر سید احمد خان، محمد علی جوہر جیسی بڑی شخصیات کے خلاف بھی ان کا قلم بڑی روانی سے چلتا ہے۔ سر سید کا خاکہ بلاشبہ مداحی ہے لیکن جو عیب نظر آیا اسے ضرور

لکھ دیا۔ محمد علی جوہر کے مضمون میں ان کی تعریف لکھتے لکھتے اچانک ان کے خلاف لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کے لہجے کا توازن کچھ بگڑ جاتا ہے لیکن رائے کے توازن میں مزید نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔

کسی شخصیت کا مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مطالعہ کرنے والا اپنی پسند و ناپسند سے بالاتر ہو اور وہ شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کو بلا کم و کاست منظر عام پر لائے۔ شخصیت میں پائی جانے والی خصوصیات کو اس طریقے سے بیان کرے جس انداز میں وہ اس شخصیت کا حصہ ہیں اور ان پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ مولوی عبد الحق نے ایک کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور دوسرا انھوں نے اپنی پسندیدہ خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ ''دیومالی'' کی مثال لیجیے اس کا یہی پس منظر ہے۔ اس میں مولوی صاحب کو جیسے خود مقصد کی دھن تھی اسی طرح ''دیو'' کو تھی۔ نور خان کی وضعداری، جہد مسلسل، ہمدردی اور نیک نفسی کی وجہ سے مولوی صاحب نے اسے گدڑی کا لعل کہا۔

> ڈاکٹر عبد الحق کی سیرت نگاری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کبھی زیرِ تحریر شخص کے مدِ مقابل یا فریق کی صورت اختیار نہیں کرتے۔ بطور سیرت نگار انھیں اپنی ذمے داریوں کا احساس ہوتا ہے۔ نواب حبیب الرحمان شیروانی کہتے ہیں کہ مولوی عبد الحق نے ''چند ہم عصر'' میں جس طرح کے حالات لکھے ہیں وہ ''نمونہ ہیں کہ کسی ممتاز آدمی کے اوصاف پر مخالف، موافق رائے کس طرح ظاہر کی جائے۔'' (۲۲)

''چند ہم عصر'' میں مولوی صاحب کی کچھ تقریریں ہیں اور کچھ ان کے مکاتیب یا دوسری تحریروں سے اقتباس لے کر شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تحریریں خاکہ نگاری کے فن پر مکمل طور پورا نہیں اترتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی اِن تحریروں کا مقصد خاکہ نگاری نہیں تھا لیکن یہ تحریریں خاکہ نگاری کی سب خوبیوں سے خالی بھی نہیں ہیں۔ شیخ غلام قادر گرامی اور امتیاز الدین کے خاکے ایسے ہی ہیں جنھیں مکمل تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان میں شخصیت کے کلیدی پہلوؤں کی طرف ایسے اشارے ہیں جن کی بنیاد پر بھرپور خاکے کہے جا سکتے ہیں۔

''چند ہم عصر'' کی وہ سیرتیں جو خاص طور پر لکھی گئی ہیں ہیئت و مواد دونوں اعتبار سے مناسب ہیں۔ ان تحریروں میں ربط، تسلسل، سلیقہ مندی، توازن اور اختصار موجود ہے۔ خاکے کے کردار ہمارے سامنے بولتے، چالتے، ہنستے، کھیلتے اور واقعی شکل و صورت میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اور یہ سیرت نگاری کا بہت بڑا کمال ہے۔ نور خان، نام دیو، سید علی بلگرامی، چراغ علی، عماد الملک، سرسید وغیرہ کا شمار ایسے ہی خاکوں میں ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کے اسلوب نے ان کے خاکوں میں حسن اور تازگی پیدا کر دی ہے جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا مجموعہ ''گنجینۂ گوہر'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں سترہ خاکے ہیں۔ شاہد احمد کا مخصوص طرز تحریر انھیں دوسرے خاکہ نگاروں سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ ان کا اسلوب عام بول چال کے قریب ہے۔ واقعات کا بیان براہ راست اور بے تکلف ہے۔ شاہد کے فقروں کی روانی آتش کی مرصع سازی کی مثل ہے۔ انداز بیان اتنا

خوبصورت ہے کہ خاکہ نگاری کا فطری انداز بیان ہی معلوم ہوتا ہے۔ ان کے خاکوں میں بے تکلفی کی ایک خوشگوار فضا ملتی ہے۔

چہرہ نویسی میں کوئی ان کا مدمقابل نہیں ہے۔ دوسروں کے لکھے ہوئے چہرے پڑھ کر آپ دھوکا کھا سکتے ہیں۔ اس چہرے سے ملتے جلتے خدوخال پر کسی خاص چہرے کا گمان کر سکتے ہیں۔ لیکن شاہد کا صاحب چہرہ اگر کہیں ملے گا تو اسی خاص آدمی کے خدوخال ابھر کر سامنے آئیں گے۔ جگر مرادآبادی کے حلیے میں ان کا چہرہ دیکھیے۔

> ''کالا گھٹا ہوا رنگ۔۔۔ اس میں سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر الجھے ہوئے پٹھے، گول چہرہ، چہرے کے مقابلے میں ناک کسی قدر چھوٹی اور منہ کسی قدر بڑا۔ کثرت پان خوری کی وجہ سے منہ اگالدان۔۔۔ بائیں ہاتھ میں ایک میانہ قد کا اٹاچی کیس۔'' (۲۳)

ایسے ابھرے ابھرے نقوش کی تصویر بنانے کے لیے فرحت اللہ بیگ چار ورق سیاہ کرتے، مولوی عبدالحق اتنی جزئیات کا احاطہ ہی نہ کرتے یہ فقط شاہد دہلوی ہیں جنھوں نے اس طریقے سے ہمیں جگر سے متعارف کرایا۔ شاہد دہلوی کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ کم از کم الفاظ میں تمام جزئیات زندہ و متحرک پیش کر دیتے ہیں۔ چہروں کا یہی انداز حسن نظامی، میراجی، میر ناصر علی اور جمیل جالبی وغیرہ کے خاکوں میں ہے۔

شاہد احمد دہلوی میں یہ خصوصیت بھی موجود ہے کہ وہ لوگوں کے عیوب و محاسن بے لاگ پیش کرتے ہیں۔ تمام خوبیاں اور خامیاں بلاکم و کاست بیان کرتے ہیں وہ مولوی عبدالحق کی طرح شخصیت کو اپنی پسندیدہ خوبیوں یا عقیدت کے تناظر میں نہیں دیکھتے۔ شاہد احمد معروضی انداز میں اپنا تاثر لکھے چلے جاتے ہیں۔ وہ عیب کو عیب اور خوبی کو خوبی کہتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے میراں جی کا خاکہ بڑی ہمدردی سے لکھا لیکن میراں جی کی کمزوریوں پر ایک قابل جراح کی طرح نہایت بے دردی سے نشتر چلائے اور یہی انداز انھوں نے اپنے دوسرے خاکوں میں بھی قائم رکھا۔

شاہد صاحب ایک تو شخصیت کو الجھاتے نہیں اور دوسرے اسے قاری کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ ان کے خاکوں میں بڑی سلاست اور بے ساختگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اصل شخصیت تک پہنچنے کے لیے جو ذریعے استعمال کرتے ہیں وہ ان کے انداز تحریر کی بدولت بہت پرکشش معلوم ہوتے ہیں۔

خاکہ نگاری میں ''چند ہم عصر'' ''گنج ہائے گراں مایہ'' اور ''گنجینۂ گوہر'' کو اردو ادب میں خاکے کی اہم کتابیں سمجھا جاتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں مثلاً حسن نظامی، منٹو، عظیم بیگ چغتائی، جمیل جالبی، جوش ملیح آبادی وغیرہ کو اردو ادب میں اہم سمجھا جاتا ہے۔ ناقدین کی آراء، فنی تجزیے، خاص طور پر ان کے اسلوب کے پیش نظر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں شاہد احمد دہلوی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالحق، ڈاکٹر، چند ہم عصر، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۴

۲۔ Beatrica Sawnders, Portrait of Genius, G. Britain 1959 P-VII

۳۔ ایضاً

۴۔ نظیر صدیقی، تاثرات و تعصبات، شعبہ تحقیق و اشاعت مدرسہ عالیہ، ڈھاکا، ۱۹۶۱ء، ص ۳۱۱

۵۔ یحیٰ امجد، فن اور فیصلے، کتابیات حمید نظامی روڈ، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۵۵

۶۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینۂ گوہر، دیباچہ: جمیل جالبی مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۸، ۹

۷۔ یحیٰ امجد، فن اور فیصلے، کتابیات حمید نظامی روڈ، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۳

۸۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، مجلس ترقی اردو ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱۱۳

۹۔ عبدالحق، ڈاکٹر، چند ہم عصر، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۵

۱۰۔ ایضاً ص ۳۴

۱۱۔ ایضاً ص ۴۵

۱۲۔ ایضاً ص ۱۱۹

۱۳۔ سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر، رشید احمد صدیقی فن اور شخصیت، نیشنل بک ڈپو، پوچار کمان، حیدر آباد، ۱۹۷۶ء، ص ۲۲۶

۱۴۔ محمود الٰہی، ڈاکٹر، مولوی عبدالحق بحیثیت شخصیت نگار، برگ گل پبلشر، کراچی، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۲۵۵، ۲۵۴

۱۵ شاہد احمد دہلوی، نگاہ اولین، مشمولہ: ساقی، دہلی، ستمبر ۱۹۳۳ء، ص ۳

۱۶۔ یحیٰ امجد، فن اور فیصلے، ص ۵۳

۱۷۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینۂ گوہر، ص ۲۳

۱۸۔ شاہد احمد دہلوی، بزم خوش نفساں، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۶۹

۱۹۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینۂ گوہر، ص ۶۰

۲۰۔ ساقی (سالنامہ)، کراچی، ۱۹۱۶ء، ص ۱۴

۲۱۔ نیا دور، کراچی، تبصرہ پروفیسر عطاء الرّب، شمارہ: ۳۳، ص ۳۴۲

۲۲۔ حبیب الرحمان، شیروانی، نواب، مقدمہ: مقدمات عبدالحق، مشمولہ: یادگار عبدالحق، مرتبہ: سید معین الرحمان، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۴۴

۲۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقاء، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۳۹۰